

## لفظوں کا سامری مشتاق احمد یوسفی

محمد جاوید احمد (عنبر مصباحی)

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تلخیص

مشتاق احمد خان یوسفی (۱۹۲۳ء ٹونک، راجستھان۔ ۲۰۱۸ء کراچی، پاکستان) اردو زبان و ادب کے ایک بلند پایہ طنز و مزاح نگار گزرے ہیں۔ معنی خیزی کے لحاظ سے دیگر طنز و مزاح نگاروں کے بالمقابل یوسفی کی تحریریں بہت اعلیٰ ہوتی ہیں۔ چراغ تلے (۱۹۶۱ء)، خاکم بدہن (۱۹۷۰ء)، زرگزشت (۱۹۷۶ء)، آب گم (۱۹۹۰ء) اور شام شعر یاراں (۲۰۱۴ء) ان کے قلمی یادگار ہیں۔ جس طرح ایک ماہر مصوّر اپنی تخلیقات میں ایک ایک چیز پہ کافی غور و خوض کرتا اور ہر خط و خال کو بہت باریکی سے جوڑ کر ایک پینٹنگ تیار کرتا ہے، یوسفی بھی اپنی تحریروں میں اسی روش کو اپناتے ہیں۔ اس لیے ان کی تحریریں طائرانہ نگاہ نہیں، بلکہ شاہینی نظر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کی یہ اہم خوبی ہے کہ جتنی بار پڑھی جائیں اتنا ہی لطف دیتی ہیں۔

بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں، جنہیں اپنی کوئی ایسی خواہش پوری ہوتی ہوئے دیکھنا نصیب ہو، جس کے جلد تعبیر پانے کی بہ ظاہر کوئی صورت دکھائی نہ دیتی ہو۔ خورشید الاسلام بھی ان ہی خوش نصیب لوگوں میں ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کے آسمان پہ یوسفی کی چمک دمک سے پہلے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا:

”ہمارے طنز و ظرافت پچھلے اٹھتر برس میں نشوونما کی بہت سی منزلوں سے گزرے۔ چند لکھنے والوں نے ان میں اپنے ماحول کی بیدار، بے باک اور بے لوث ترجمانی کی۔ رتن ناتھ سرشار کے زمانے میں اس فن کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اکبر نے اسے فنی نقطہ نظر سے معراج کمال کو پہنچایا۔ ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار نے اسے حقائق سے لبریز کیا۔ فرحت اللہ نے اسے پیار کیا، پطرس اور رشید صدیقی نے اسے خوش سلیقگی سے برتا، لیکن ابھی تک ایک مربوط اور عظیم کارنامے کی کمی ہے۔ ممکن ہے یہ اسی قسم کی خواہش ہو جو مولانا روم کو تھی۔“

گفتم کہ یافت می نشود جتہ ایم ما

گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(مقالہ 'طنز و مزاح'، مشمولہ 'سالنامہ نقوش لاہور'، شمارہ ۱۷-۱۸، ۲۷، طنز و مزاح نمبر: ص، ۴۲، مرتبہ محمد طفیل، ۱۹۵۹ء)

خورشید الاسلام کے خواب نے یوسفی کی شکل میں تعبیر پائی۔ یوسفی کا طلوع ہوا اور وہ سورج اس قدر روشن ہو گیا کہ غیر جانب دار اور بے لاگ ناقدین تک کی آنکھیں چونڈھیا گئیں اور وہ تنقید چھوڑ کر تاثرات لکھنے پر مجبور نظر آئے۔ آل احمد سرور جیسے متوازن، معتدل اور بے لاگ نقاد نے مشتاق احمد یوسفی کو نہ صرف مزاحیہ ادب بلکہ پورے اردو ادب کی آبرو قرار دیا۔

(مقالہ 'آب گم ایک تاثر، آل احمد سرور، مشمولہ 'مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ، مرتبہ ڈاکٹر مظہر احمد: ۱۳۰، کتابی دنیا، دلی، ۲۰۰۳ء)

آئیے اب یوسفی کے فن کا جائزہ لیں۔ ان کا یہ اقتباس دیکھیے:

”سود پر روپیہ چلانا انسان کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اس کے بارے میں کم از کم اردو میں ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ پہلے قدیم ترین پیشے کا حق تو مرزا ہادی رسوانے امر اوجان ادا میں اور بعد ازاں سعادت حسن منٹو نے کمال حسن و خوبی و خوباں ادا کر دیا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ منٹو تو ساری عمر قلم برداشتہ ہی رہے۔“

(زرگزشت: ۱۱، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دلی، ۲۰۱۳ء)

یوسفی کی فن کاری ملاحظہ ہو۔ اس پورے اقتباس میں انھوں نے جسم فروشی کے پیشے کا صراحتاً ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر پھر بھی لفظوں میں شعلے چھپا کر رکھ دیے ہیں۔ اقتباس میں قلم برداشتہ کو دو طرح سے پڑھا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ قلم ایک لفظ اور برداشتہ دوسرا لفظ ہو۔ اس صورت میں قلم برداشتہ کا مفہوم یہ ہو کہ قلم اٹھائے رہے۔ منٹو نے طوائف کے موضوع اور ان کے مسائل پہ کئی افسانے لکھے ہیں۔ چونکہ پہلے اسی موضوع کی طرف اشارہ ہو رہا تھا تو یوسفی کے جملے کا مفہوم یہ ہو گا کہ منٹو اس موضوع پر ہمیشہ قلم اٹھائے رہے یعنی ہمیشہ لکھتے رہے۔ دوسرا طریقہ اس کو پڑھنے کا یہ ہے کہ داشتہ، بر اور قلم تین الگ الگ لفظ مانے جائیں۔ اب معنی یہ ہو گا کہ منٹو کا قلم ہمیشہ داشتہ پر ہی رہا۔ یہ مفہوم بعید ہے مگر یوسفی کی ذہانت و فطانت اور ان کی طنز و مزاح نگاری کے منہج کا مطالبہ یہی ہے کہ قارئین اس دوسرے مفہوم تک کا سفر ضرور کریں۔ یوسفی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جملے کو کبھی اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ قاری پلٹ کر پیچھے کی طرف آئے اور غور و فکر میں ڈوب جائے اور پھر اس کے منہ سے ایک طویل سسکاری، یا اوہ کی آواز نکلنے پہ مجبور ہو جائے۔

طنز کی کاٹ دیکھیے کہ دنیا کے سب سے قدیم پیشے کے طور پہ کاشت کاری، لکڑی کٹائی، جنگل صفائی، مزدوری، وغیرہ کسی کا نام نہیں لیا بلکہ جسم فروشی کو قدیم ترین پیشہ قرار دیا۔ یعنی مرد اتنا ہوس ناک بھیڑیا ہے کہ اسے کھانے کی بھوک سے پہلے ہوس کی بھوک ہوتی ہے۔ دوسرے قدیم ترین پیشے کے طور پہ انھوں نے مہاجنی کا نام لیا۔ یعنی عورتوں کے استحصال کے بعد غریبوں کا استحصال اہل ثروت کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ یوسفی نے دبیز تہوں میں دبا کر سماج پہ اتنی گہری چوٹ کی ہے کہ حساس دل لوگوں کے لیے اس عبارت پہ رُک کر اور کچھ دیر سوچے بغیر گزر جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر موجودہ زمانے میں غریبوں، مجبور لوگوں اور خواتین کے استحصال کے جائزے کے ساتھ یوسفی کے اس پیرا گراف کو پڑھا جائے تو یوسفی کے اس جملے کا مطلب یہ ہو گا کہ سائنس اور علوم

کی لامحدود ترقی کے باوجود عقل و فکر کے لحاظ سے یہ انسان نما مخلوق پتھر کے زمانے سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ بلکہ اس کی فکری اور عملی سوچ نے معکوس ترقی کی ہے۔ جوں جوں اس کی سائنسی اور علمی ترقی بڑھتی گئی، یہ عورتوں کے استحصال اور سوپر رور و پیہ لگا کر غریبوں کا خون چوسنے کے نئے نئے طریقے بناتے چلے گئے ہیں۔ جب ہم جملہ کمال حسن و خوبی و خوبیاں اور 'ساری عمر' پہ توجہ مرکوز کرتے ہیں تو مفہوم میں اور زیادہ شدت کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی پوری زندگی منٹو کا قلم ہمیشہ دانشاؤں پہ ہی چلتا رہا اور وہ بھی پوری توجہ اور کمال کے ساتھ۔ یعنی انھوں نے موضوع کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔

موجودہ عہد میں جہاں تنقید کی قسمیں، ادبی اصناف، پُر تعیش زندگی کے لیے مختلف طرح کے آلات اور سائنسی ترقی کے اسباب بڑھے ہیں، وہیں رشتوں کی قسموں میں بھی حذف و اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ پہلے دو ہی رشتے ہوتے تھے: خونی اور قلبی۔ یعنی خدا کی جانب سے بنائے گئے رشتے اور اپنے کمائے ہوئے دلوں کے رشتے۔ مگر اب رشتوں کی کئی قسمیں ہو گئی ہیں اور بعض قسموں کی اصطلاح بھی بدل گئی ہے۔ اول خونی رشتے یعنی جس رشتے کا خون کیے بغیر آپ ترقی نہیں کر سکتے ہیں اور آپ کا خون پیے بغیر دوسرے لوگ نہ رہ سکتے ہوں۔ دوم قلبی رشتے، قلب کا ایک معنی جہاں دل کے ہے وہیں دوسرا معنی بدلنا بھی آتا ہے، جدید زمانے کے لوگوں نے فرسودہ اور دقیقاً نوسی معنی کو چھوڑ کر قدرے جدید معنی کو پسند کیا اور اس لیے اب اس سے وہ رشتے مراد ہوتے ہیں جنہیں آپ ضرورت اور وقت کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ سوم کلبی رشتے یعنی کتوں سے پریم۔ چہارم اقتصادی رشتے یعنی جن رشتوں کی وجہ سے آپ کی اقتصادی ترقی کے امکانات خوب بڑھ جائیں۔ پنجم تجارتی رشتے یعنی وہ رشتے جو آپ ایسے لوگوں سے رکھتے ہیں جن سے آپ تجارت کرتے ہیں۔ ششم ملازمتی رشتے یعنی وہ رشتے جو ایک ملازم اپنے باس لوگوں سے رکھتا ہے۔ ہفتم سیاسی رشتے یعنی جھوٹ بولنے اور سیٹیاں بدلنے کا رشتہ۔ ہشتم رشوتی رشتہ یعنی کمیشن کھانے کھلانے کا رشتہ۔ اوہ! ایک انوکھا رشتہ تو چھوٹ ہی گیا تھا: ہم جنسی ریلیشن شپ۔

چوں کہ یہ زمانہ مختلف طرح کے اقتصادی اور صنعتی انقلابات کا ہے، مثلاً سبز انقلاب، سفید انقلاب، سرخ انقلاب وغیرہ اور ان سب پہ مسترد پسند کا حق یعنی رائٹ ٹو چوائس کا نعرہ۔ اس لیے ان تمام رشتوں میں اقتصادی اور معاشی اعتبار سے سب سے بے کار خونی رشتہ ہے۔ کیوں کہ خونی رشتے داروں کے انتخاب میں انسان کو کسی طرح کا اختیار نہیں ملتا ہے، بائی ڈیفالٹ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ رائٹ ٹو چوائس کو کچلنے کا کام انجام دیتا ہے۔ اس سے اچھے برے ہر طرح کے رشتے دار پہلے گلے لگتے ہیں پھر گلے پڑ جاتے ہیں۔ جب کہ یہ دور آزادی اور خود پسندی کا ہے، اس لیے انسان سب سے زیادہ ناقدری ان ہی رشتوں کی کرتا ہے۔ المختصر اس زمن دھواں و بدبو میں جو بھینس جتنی زیادہ دودھ دے وہ اتنی ہی قریبی رشتے دار ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ایسے ہی رشتوں پہ چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”رفتہ رفتہ مولانا، خلیفہ، گھوڑا اور بزرگوار۔۔۔ بہ اعتبار اہمیت، اسی ترتیب سے خاندان کے فرد گردانے گئے اور یہ ادغام و اختلاط اتنا مکمل تھا کہ گھوڑے کی لنگڑی ٹانگ بھی کنبے کا اٹوٹ انگ بن گئی۔“

(آب گم: ۱۳۲، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۷ء)

یوسفی کے کردار بشارت کے گھر میں سب سے زیادہ کارآمد مولانا تھے جو ان کے منشی تھے، ان کے بعد خلیفہ اور اس کے بعد گھوڑا۔ اس لیے اسی ترتیب سے انہیں گھر کے اہم رکن کی حیثیت حاصل تھی۔ والد بزرگوار کی ذات گھوڑے سے بھی کم فائدہ مند چیز تھی اس لیے وہ گھر کے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھر کے سب سے غیر اہم اور بے کار رکن تصور کیے جاتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ گھوڑا ضرورت بنا ہوا تھا اس لیے اس کی لکڑی والی نقلی ٹانگ بھی گھر کا اٹوٹ حصہ قرار دی گئی تھی۔ اس جملے میں یوسفی نے اس اقتصادی ذہنیت اور مفاد پرست سماج پہ بہت گہری چوٹ کی ہے۔

اب یوسفی کی اس عبارت کو دیکھیے:

”میں نے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ چودہ پندرہ لاکھ آدمی (اخبار والے اب آدمی کو آدمی کہنے سے شرماتے ہیں۔ افراد اور نفوس کہتے ہیں!) ضرور رہتے ہوں گے۔ لیکن کہیں کتابوں اور عطریات کی دکان نہ دیکھی۔ کاغذ تک کے پھول نظر نہ آئے۔“

(آب گم: ۶۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء)

یہاں یوسفی کے فن کی گہرائی قابل مطالعہ ہے۔ انسان، انسانیت اور انسانی افکار کے گرتے ہوئے معیاروں پہ بہت گہرا طنز کیا ہے۔ اس عبارت کا ایک سادہ منہوم یہ ہے کہ انہوں نے شہر کے چار محلے لالو کھیت، بہار کالونی، چاکی واڑہ اور گولیمار کا چپہ چپہ چھان مارا مگر انہیں کتابوں، اصلی پھولوں، عطروں سمیت نقلی پھولوں کی بھی کوئی دکان نہیں دکھائی دی۔ مگر یوسفی نے اسے طنز کا گنہینہ دیا۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان چاروں محلے میں علم بے زار لوگ رہتے ہیں۔ اس لیے وہاں کتاب کی کوئی دکان چل ہی نہیں سکتی ہے۔ جس چیز کا جہاں چلن ہوتا ہے وہاں اس کی دکانیں ہوتی ہیں، مگر جب کہیں کسی چیز کی خرید و فروخت نہ ہوتی ہو تو پھر اس کو دکانوں میں سجانے کا کوئی مطلب نہیں بنتا ہے۔ اگلا نکتہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ صرف علم بے زار ہی نہیں ہیں، بلکہ ان کی جہالت نے انہیں ہر اس چیز سے دور کر دیا ہے جس سے اچھی مہک آسکتی ہو۔ علم جہاں جسم اور روح دونوں کو معطر کرتا ہے وہیں عطر اور خوش بو جسمانی اور ظاہری نظافت و لطافت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مگر ان محلوں کے چودہ پندرہ لاکھ لوگ دونوں طرح کی خوش بوؤں سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ اور حد تو یہ ہے کہ وہ نقلی پھولوں کی طرف بھی نظر کرنا نہیں چاہتے ہیں، اس لیے کاغذ کے پھولوں کی بھی کوئی دکان نظر نہیں آئی۔

ایک نئی اصطلاح آئی ہے: نیوٹرل جینڈر۔ یعنی جملے میں ایسے الفاظ لانا جو کسی خاص صنف پہ دلالت نہ کرتے ہوں بلکہ وہ الفاظ مذکر کے ساتھ مؤنث کو بھی اپنے اندر برابر برابر سمو لیتے ہوں، جیسے انگریزی میں Man اور Woman کی جگہ Person کہنا۔ یا جملے میں مذکر کے ساتھ مؤنث کی ضمیر بھی صراحتاً ذکر کرنا جیسے He کے ساتھ بدل کی علامت (/) لگا کر She بھی چپکانا۔ اس لنگڑی لولی انگریزی روش کی پیروی میں اب اردو میں بھی آدمی کی جگہ نفوس لکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ عموماً لفظ آدمی سے مرد مراد ہوتے ہیں۔ مگر

یوسفی نے صنعتِ حُسنِ تعلیل کا سہارا لیتے ہوئے یہاں بھی مزاح کے پیرائے میں بہت گہری چوٹ کر ڈالی۔ یوسفی نے تیسرا نکتہ یہ نکالا کہ لفظ آدمی کو لفظ نفوس سے بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ اب اخبار والے نچلے طبقے اور گندی بستوں میں رہنے والے انسانوں کو آدمی کہنے میں شرماتے ہیں، اس لیے وہ انھیں نفوس کہتے ہیں۔ نفوس لفظ نفس کی جمع ہے، جس کا لغوی معنی ہے ذی روح۔ یہ لفظ انسان کے ساتھ جانوروں کو بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ امیر معاشرہ غریب بستوں میں رہنے والے لوگوں کو انسان ماننے کو بھی تیار نہیں ہے۔ جب کہ ان امیر بستوں میں رہنے والے مغرور کمینوں کی اپنی حقیقت کیا ہے، اس پر طنز کرتے ہوئے یوسفی لکھتے ہیں:

”چنانچہ جب کچھ دن اس نے ایٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی میں چیر اسی کی ملازمت کی تو اپنا نام مرزا وحید الزماں بیگ لکھوا دیا۔ بس اسی زمانے سے چلا آ رہا تھا۔ دراصل یہ اس افسر کا نام تھا جس کی وہ بیس سال پہلے حجامت بنایا کرتا تھا۔ وہ لا ولد مرا۔ رشوت سے بنائی ہوئی جائداد پر بھتیجیوں بھانجوں نے اور نام پر اب اس نے قبضہ کر لیا۔“

(آب گم: ۱۳۰، ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، دلی، ۲۰۱۷ء)

یوسفی کا ایک انداز یہ ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو جان بوجھ کر مبہم چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی جان بوجھ کر تشریح اور تفصیل لکھتے چلے جاتے ہیں۔ دونوں مقامات پہ مقصد قارئین کو اس تہ تک پہنچانا ہوتا ہے، جہاں تک قارئین کبھی ابہام کے بغیر تو کبھی یوسفی کی رہنمائی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً یہاں انھوں نے افسر کے لا ولد ہونے کے پہلو کو نشہ چھوڑ دیا تاکہ قاری خود ہی ذہن پہ زور دے اور اس کی لا ولدی کے مختلف اسباب و حالات تک پہنچ جائے۔ اس مختصر سی عبارت میں انھوں نے کئی سماجی پہلوؤں کو چھیڑا ہے۔ پہلی چیز یہ کہ انسان یہ سوچے بغیر کہ یہ زندگانی بہت مختصر ہے، دولت جمع کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے آزما تا ہے۔ حلال و حرام کی تمیز بھلا دیتا ہے اور خود کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے لفظ رشوت کا لائقہ خاص طور پہ لگایا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ افسرانہ شان پہ کبھی غرور نہیں کرنا چاہیے۔ بڑے آدمیوں کو دو چیزوں پہ زیادہ غرور ہوتا ہے۔ اپنے نام یعنی عہدے پہ اور دوسری چیز اپنی دولت پہ۔ جائز و ناجائز ذرائع سے بنائی جانے والی دولت جس طرح آتی ہے ویسے ہی رخصت ہو کر دوسروں کے پاس چلے جاتی ہے۔ اسی طرح جس نام پہ غرور ہوتا ہے وہ بھی کوئی اور اڑا لیتا ہے، یہاں تک کہ ایک چیر اسی اور حجام بھی اس اعلیٰ شخص کے نام پہ قبضہ کر لیتا ہے۔

تیسرا نکتہ یہ کہ باپ دادا اور خاندان کا نام بدلنا اب فیشن بن گیا ہے۔ خاص طور پہ اپنے آبائی علاقے سے دور جا کر بسنے والے لوگ بہت آسانی اور بڑی ڈھٹائی سے اپنا شجرہ نسب بدل لیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی محنتی اور اپنے مشن کے لیے جنونی ہو تو وہ ہواؤں کا رخ موڑ سکتا ہے۔ بھارت کے تناظر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایک امبیڈ کر کے قلم نے کتنے اعلانسل کے لوگوں کو اپنے باپ دادا کا نام بدل کر کم تر ذات کا سرکاری تصدیق نامہ بنوانے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ جو آج سے پچاس سال پہلے کچھ لوگوں کو چھوٹی ذات کا قرار دے کر اپنے کنویں سے پانی تک لینے نہیں دیتے تھے کہ اس سے وہ اچھوت ہو جائیں گے،

آج ان کے ناتی پوتے سرکاری کاغذات لیے گھوم گھوم کر ہر ریاست کی سرکاری نوکری والی ویب سائٹوں پر یہ اشتہار لگا رہے ہیں کہ وہ کم تر ذات سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں بھی اسی کم تر طبقے کے محفوظ کونے میں نوکری دی جائے۔

پروفیسر اور لکچرار بالخصوص اردو زبان و ادب کے لکچرار اور پروفیسر مشتاق احمد یوسفی کے طنز اور مزاح کے خاص موضوع ہیں۔ انہوں نے پروفیسر کے نام سے چوبیس صفحے کا ایک طویل مزاحیہ قلم بند کیا ہے جو ان کی کتاب ”خاکم بدہن“ کا دوسرا سب سے طویل مزاحیہ ہے۔ ایک کتب فروش کی زبانی ایک نئے نوپلے لکچرار کا خاکہ اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مگر ان صاحب کو کیا کہو گے جو نئے نئے اردو لکچرار مقرر ہوئے ہیں۔ میرے واقف کار ہیں۔ اسی مہینے کی پہلی تاریخ کو کالج سے پہلی تنخواہ وصول کر کے سیدھے یہاں آئے اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ لگے پوچھنے صاحب! آپ کے یہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے جس میں ”دھرن تختہ“ کے معنی ہوں؟“

(مزاحیہ: صبغہ اینڈ سنز، مشمولہ خاکم بدہن: ۲۳، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دلی، ۲۰۱۸ء)

یوسفی کا قلمی کمال یہ ہے کہ جس طرح یوسفی کافی غور و خوض اور طویل مشق کے بعد ایک ایک جملے اور پیرا گراف کو مکمل کرتے ہیں، ان کی تحریروں کو پڑھنے کے لیے بھی سرسری نظر کے بجائے شاہینی نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوسفی کی تحریروں کو پڑھنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کی عبارت کو چبا چبا کر پڑھا جائے۔ مذکورہ بالا اقتباس کے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر پڑھیں تو اندازہ ہو گا کہ وہ کس طرح لفظوں کا جادو دکھا رہے ہیں۔ صبغہ اینڈ سنز نے پہلے کہا کہ ایک شخص نئے نئے لکچرار ہوئے ہیں۔ پھر کہا کہ وہ میرے واقف کار ہیں۔ یعنی ان کی تعلیمی قابلیت اور اس قابلیت میں موجود گڑھوں سے بھی خوب واقف ہوں۔ وہ بہ حیثیت لکچرار ایک ماہ مکمل کر چکے ہیں اور ایک ماہ کی تنخواہ بھی لے چکے ہیں مگر ان کے علم و فہم کی صلاحیت یہ تھی کہ جیسے ہی ان کے سامنے ’دھرن تختہ‘ کا لفظ آیا، حیران و پریشان ہو گئے۔ اسی سرایتگی کی حالت میں تنخواہ لے کر بہت بے چینی کے ساتھ اور اس قدر تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آئے کہ ان کی سانس پھول رہی تھی۔ اپنی سانس بحال کرنے سے پہلے ہی وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کے یہاں منٹو کی وہ کتاب بھی ہے جس میں ’دھرن تختہ‘ کے معنی ہوں؟۔ یعنی وہ لکچرار صاحب، منٹو کی ذات اور اس کے فن سے بھی نااہل ہیں۔ یا پھر بدحواسی میں ان کے اوسان اس قدر خطا ہو گئے تھے کہ انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ منٹو افسانہ نگار ہیں، کوئی لغت نویس یا افسانوں کے شارح نہیں۔

یوسفی کے اس اقتباس کا ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ آج کل کے پروفیسروں کا حال یہ ہے کہ ان سے زیادہ علم تو کتب فروشوں اور وہ بھی صبغہ اینڈ سنز جیسے تاجران کتب کے پاس ہے۔ اس لیے ادھر ادھر سے اٹھا کر کسی کو لکچرار بنانے سے اچھا ہے کہ جس کے پاس وہ لکچرار المدد کا نعرہ لگاتے ہوئے پہنچتے ہیں، ان کو ہی اس طرح کے منصب پہ فائز کر دیا جائے۔

مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مشہور کردار پروفیسر عبدالقدوس پہ طنز کے تیر برساتے ہوئے لکھا:

”پہلے اپنے والد ماجد کو بھی خط لکھتے تو آخر میں ”مابعدار، پروفیسر قاضی عبدالقدوس، ایم۔ اے، بی۔ ٹی، گولڈ میڈلسٹ“ لکھ کر، گولڈ میڈلسٹ کے نیچے احتیاطاً خط کھینچ دیا کرتے تھے کہ بندہ بشر ہے، مبادا نظر چوک جائے۔“

(مزاحیہ، پروفیسر، مشمولہ، خاکم بدہن: ۹۸، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی، ۲۰۱۸ء)

یوسفی کے الفاظ اور جملوں سے بہ ظاہر بہت سادہ لوحی ٹپک رہی ہے مگر سوئی کی چھن کے اثرات بہت گہرائی تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ کچھ لوگ زندگی میں تھوڑا بہت حاصل کرتے ہیں تو ہفتے کے ساتوں دن اور دن کے چوبیس گھنٹے اس کا پرچار ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اسے کلمہ لالہ الا اللہ کی طرح ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کا حالت نزع سے پہلے ان کی اس حصول یابی کے بارے میں مطلع ہونا ضروری ہے، ورنہ فرشتے بے حساب جہنم میں ڈال دیں گے۔ بعض لوگ جیسے تیسے اور بہت مشکل سے بی اے، ایم اے وغیرہ پاس کر لیتے ہیں مگر اپنے نام کے آگے بہت پابندی سے اپنی ڈگریوں کے نام لکھتے اور لکھواتے ہیں۔ بہار پبلک سروس کمیشن پہلے صرف سول سرونٹ کی بحالی کا فریضہ انجام دیتا تھا اور مرکزی حکومت کے یونین پبلک سروس کمیشن کے طرز کار ریاستی ادارہ مانا جاتا تھا۔ حکومت بہار نے ۲۰۲۵ء کے ریاستی انتخاب سے پہلے دس لاکھ نوکری دینے کا ہدف جلد حاصل کرنے کے مقصد سے ۲۰۲۳ء میں بی پی ایس سی کو اسکول کے اساتذہ سمیت کئی اور طرح کی بھرتیوں کا ذمہ بھی سونپ دیا۔ پچھلے دو سالوں میں اسکول ٹیچروں کی شکل میں کئی ایسے نمونے دیکھنے کو ملے جو اپنے نام کے آگے ”بی پی ایس سی ٹیچر“ لکھتے اور اپنی دو پہیوں پر آگے پیچھے بھی اسی عنوان کا اشتہار لگا کر خوب پرچار کرتے ہیں تاکہ دوسرے اسکولی اساتذہ پر ان کی برتری ثابت ہو سکے۔ اسی طرح کی ذہنیت پر چوٹ کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے یہ پیرا گراف لکھا ہے۔ یوسفی کے فن کی طرح ان کا کردار بھی چیزے دیگر ہوتا ہے۔ یہ پروفیسر صاحب بھی الگ ہی نمونہ تھے۔ والد صاحب کو بھی خط لکھتے تو اس میں اپنے گولڈ میڈل کا ذکر ضروری سمجھتے اور یہیں پر بس نہیں بلکہ اس کے نیچے خط بھی کھینچ دیتے۔ اس سے بڑا کمال تو یہ کہ جب جب خط لکھتے، اپنی ساری ڈگریوں اور حصول یابیوں کو ضرور درج کرتے۔ عموماً بچے اپنے والدین کو ہفتہ عشرہ پر خط لکھا کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ہفتہ عشرہ پر بھی اپنے والد کو یہ احساس دلانا نہیں بھولتے کہ وہ ایم اے، بی۔ ٹی اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ اسی پروفیسر صاحب کے متعلق یوسفی کے ایک دوسرے پیرا گراف کو ملا کر پڑھیں تو صورت حال اور مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

”ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ لڑکوں نے ان کے لیکچر کی فاش غلطیوں پہ ہنسنا چھوڑ دیا۔ اب ان کے حلیے پر ٹھٹھے لگاتے تھے۔“

(مزاحیہ، پروفیسر، مشمولہ، خاکم بدہن: ۹۷، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دلی، ۲۰۱۸ء)

یوسفی نے منظر نگاری کی کہ پروفیسر صاحب کا پورا درس مسخرے کی مجلس کا نمونہ ہوا کرتا تھا۔ وہ تھے تو گولڈ میڈلسٹ مگر ان کا مبلغ علم یہ تھا کہ پوری کلاس فاش علمی غلطیوں میں گزر جاتی جسے بھانپ کر طلبہ کلاس میں ہنستے ہوئے بلکہ ٹھٹھے لگاتے ہوئے اپنا وقت گزارتے۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ لڑکے ان کی غلطیوں پر خوب ہنستے تھے لیکن اس کے باوجود پروفیسر کا علمی طنطنہ یہ تھا کہ ہر شخص

کو یہ بتانا ضروری سمجھتے تھے کہ وہ گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ اس جملے میں انھوں نے دو لفظوں کو خاص طور پر رکھا ہے۔ ایک یہ کہ لفظ غلطی سے پہلے لفظ فاش کا اضافہ کیا اور دوسرے یہ کہ ہنسنے کے معنی میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہنسنے کے بجائے لفظ ٹھٹھا لگانا کو ترجیح دی۔ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ درس گاہ میں اساتذہ کی فاش غلطیوں پہ تہقہے اور ٹھٹھے لگنے کا مطلب ہے کہ شاگرد زیادہ علم والے ہیں جو استاد کی غلطیاں پکڑ لیتے ہیں۔ معنی خیز مشتاق یوسفی کے جملوں کی تہ میں اتر کر ان کے ان جملوں پر مزید غور کیا جائے تو وہ پورے تعلیمی نظام اور اساتذہ کی علمی اور اخلاقی دیانت پر سوال اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جدید نوع کی ترقی پر مشتاق احمد یوسفی صبیغہ اینڈ سنز کتب فروش تاجر کی زبانی کہلاتے ہیں:

”ایک دن برادرانِ وطن کی ناقدری کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا ”آپ کے ہاں تو ابھی تک جہالت کی خرابیاں دور کرنے پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ترقی یافتہ ممالک میں تو اب مارا مار ایسی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، جن کا مقصد ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو محض جہالت دور ہونے سے پیدا ہو گئی ہیں۔ صاحب! وہاں علم کی ایسی قدر ہے کہ کتاب لکھنا، کتاب چھاپنا، کتاب بیچنا، کتاب خریدنا، حدیہ کہ کتاب چرانا بھی ثواب میں داخل ہیں۔ یقین مانئے، ترقی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جرم بھی نہیں کر سکتا۔“

(مزاحیہ: صبیغہ اینڈ سنز، مشمولہ خاکم بدہن: ۳۳، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء)

یہ سچ ہے اور اس کا اعتراف ہونا بھی چاہیے کہ موجودہ عہد میں مغربی دنیا سائنسی ترقی میں دیگر قوموں کے لیے امام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اعتدال، توازن اور حقائق سے نظریں چڑا کر ترتیب دیا جانے والا ان کا نظام اور سماج، جہالت اور کم علمی کی ان برائیوں سے تو دور ہو گئے جن میں وہ مشرقی اقوام کو ملوث سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے اپنے وضع کردہ نئے نظام نے مختلف طرح کی نئی نئی بیماریوں کو جنم دیا ہے۔ اسی پر چوٹ کرتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی صبیغہ اینڈ سنز کی زبانی یہ باور کر رہے ہیں کہ مغرب بھلے ہی ہمارے سماج کی برائی یعنی جہالت سے پاک ہو گیا اور اب انھیں جہالت کی برائیوں اور نقصانات پہ کتابیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ انھوں نے جہالت کی تاریکی کو مٹانے کے لیے علم کے چراغ میں جس قسم کا تیل ڈالا تھا، وہ فکری پراگندگی، ذہنی تعفن اور مختلف طرح کی روحانی بیماریوں کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اب وہاں ”علم زاد برائیوں“ کے خاتمے کے لیے کتابیں لکھی، چھاپی، بیچی اور یہاں تک کہ چرائی جا رہی ہیں۔ ان الفاظ کے بیچ میں چوری کے ذکر نے اور زیادہ معنی خیزی کا کام کیا ہے۔

مطلب علم سے در آنے والی بیماریاں اس قدر وبائی شکل اختیار کر چکی ہیں کہ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے جو لوگ کتابیں خرید سکتے ہیں وہ خرید کر پڑھ رہے ہیں اور جو خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے، وہ چوری جیسی مذموم حرکت کر کے بھی ان کتابوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو علم کی بدولت در آئی برائیوں کو دور کرنے میں ان کی مدد کر سکیں۔ ذہن پہ اور زور دے کر یوسفی کے اس پیراگراف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معنی یہ ہو گا کہ مغرب میں علم اپنا فیضان اس طرح لٹا رہا ہے کہ لوگ چور بن رہے ہیں۔

لفظوں کے بین السطور میں چھپا ایک اور نکتہ قابل توجہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ”علم عام“ ہونے کی جگہ ”محض جہالت کے دور ہونے“ کا جملہ لکھا۔ یعنی ترقی یافتہ ممالک میں علم کا مقصد محض جہالت دور کرنا ہے، جو بالکل مناسب نہیں ہے۔ فروغ علم کا مقصد

برائیوں اور خامیوں کو دور کرنا ہونا چاہیے۔ مغرب والوں نے اشاعتِ علوم کا مقصد صرف جہالت دور کرنا مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے سماج سے جہالت تو دور ہو گئی مگر فسادات اور خرافاتِ شکلیں بدل بدل کر ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس طریقے سے علم کے پھیلاؤ کو حقیقت میں فروغِ علم کا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اور یہ جملہ کہ ”یقین مانیے، ترقی یافتہ ممالک میں تو جاہل آدمی ٹھیک سے جرم بھی نہیں کر سکتا“ کا ایک ممکن مفہوم یہ ہے کہ وہاں علم کا مقصد برائیوں کا خاتمہ نہیں ہے اس لیے ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ نیک بننے کے مقصد سے زیادہ، جرم کرنے کے لیے علم حاصل کرتے ہیں۔

مغرب والوں نے معاشی اور سماجی ترقی کے اعتبار سے دنیا کے سارے ملکوں کو موٹا موٹی تین خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ پہلی قسم ترقی یافتہ ممالک (Developed Countries)۔ اس میں یورپ و امریکہ کے باہر سے صرف چند ملکوں کو شامل کیا گیا ہے۔ دوسری قسم ترقی پذیر ممالک (Developing Countries)۔ اس میں لاطینی امریکہ کے ممالک نیز ہندوستان اور چین سمیت ایشیا کے اکثر علاقے شامل ہیں۔ تیسری قسم یعنی بہت کم ترقی یافتہ ممالک (Least Developed Countries) میں براعظم افریقہ کے تقریباً تمام خطے اور کچھ ایشیائی ممالک شامل ہیں۔ یوسنی نے مغربی ممالک کے لیے یورپ یا مغرب کے لفظ کا انتخاب نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے ان کے لیے ترقی یافتہ ممالک کی اس اصطلاح کو استعمال کیا جو خود ان ممالک کی وضع کردہ ہے۔ اس کے بعد چوٹ کی کہ ان کے یہاں جہالت دور ہونے سے ترقی کا پیڑ اس قدر اونچا اور بلند ہو چکا ہے کہ اس کی بلندی سے انھیں اپنا شکار بہ آسانی نظر آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ چور اُچکے بن رہے ہیں۔ یہ ان کی علمی اور معاشی ترقی دونوں پہ بہت شدید چوٹ ہے۔ جو حقیقت بھی ہے۔ یوسنی مغرب کے فزاتی نظام کے رازدارِ درونِ خانہ رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں دنیا بھر کے ممالک کو دی جانے والی امریکی امداد کی بندی کے ٹرمپ اعلان کے بعد الجزیرہ ڈاٹ کام کے لیے ۱۲/۱۲ اپریل ۲۰۲۵ء کو اقوام متحدہ کے ایک اعلیٰ اہلکار میکسو میل گو میرا (ڈیپٹی ڈائریکٹر، یو این ای پی۔ ڈبلیو سی ایم سی) نے ایک تجزیاتی مضمون بعنوان Africa doesn't need aid. It needs control over its critical minerals لکھ کر درخواست کی کہ مغربی دنیا والے افریقہ پر خیرات کا احسان جتلانے کے بجائے انھیں ان کے حال پہ چھوڑنے کا احسان کریں۔ افریقی معدنیات بالخصوص موجودہ اور آئندہ سائنسی ترقی کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل افریقی معدنیات کی لوٹ اور اونے پونے دام لگا کر ان کی مغرب منتقلی کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ افریقہ کو ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے میں زیادہ مدت نہیں لگے گی۔ اس طرح یوسنی کے اس پورے اقتباس کا تجزیہ کرتے ہوئے بے ساختہ یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

وہ اندھیرا ہی بھلا تھا، جو قدم راہ پہ تھے

روشنی لائی ہے منزل سے بہت دور مجھے

مشتاق احمد یوسنی ایک محلے کے دفتر کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی طنز و مزاح نگاری کا جاودہ دکھاتے ہیں:

”ٹلخہ کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دفتر کی دیواریں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہاں سلیٹ کارواج نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد ان ہی میں کا ایک بچہ ایلومینیم کا جگ لے کر آیا اور مشروبِ مشرق یعنی خالص پانی کا دور چلا۔ پانی واقعی نہایت شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ گلاس کا گند اپنی صاف نظر آ رہا تھا۔“

(مزاحیہ، پروفیسر، مشمولہ، خاکم بدہن: ۱۰۱، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دلی، ۲۰۱۸ء)

اس پیراگراف میں یوسفی نے رسالے کے مدیر اور ان کے اہل خانہ کی کنجوسی (نیز شاید غربت) اور صفائی بے زاری کو خاص نشانہ بنایا ہے۔ پہلے یہ ذکر کیا کہ دفتر کے اندر ایک دوسرے کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ یعنی مکان اور دفتر دونوں ایک ہی جگہ تھے۔ یا تو انھوں نے مکان میں ہی دفتر بنایا تھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ممکن ہے کہ دفتر کو ہی مکان بنا لیا تھا جیسا کہ اپنے عہدوں کا ناجائز استعمال کرنے والے بہت سارے افراد کے بارے میں ہم پڑھتے اور سنتے ہیں۔ یوسفی نے اس تفصیل کو مبہم چھوڑ دیا ہے تاکہ ہمارے ذہن کا گھوڑا سرپیٹ دوڑتا رہے۔ مدیر موصوف کے یہاں بچوں کی تعداد زیادہ تھی، اسے بتانے کے لیے یوسفی نے بس یہ لکھ دیا کہ ٹلخہ کمرے سے ہر عمر کے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

اس کے بعد مدیر محترم اور ان کے اہل خانہ کی پراگندگی سے بے لوث محبت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دفتر کی دیواریں دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہاں سلیٹ کارواج نہیں ہے۔ یعنی ساری دیواریں بے مصرف کی تحریروں سے رنگین تھیں۔ سلیٹ کا استعمال ان چیزوں کو لکھنے کے لیے ہوتا ہے جسے بہت جلد مٹا دینا ہو۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے تک مدرسوں اور اسکولوں بالخصوص گاؤں میں کم عمر کے بچوں کو لکھنا سکھانے کے لیے سلیٹ دیتے تھے تاکہ وہ بار بار لکھ کر اور کئی بار مٹا کر جاذبِ خطا اور بہتر جواب لکھنے کی مشق کر سکیں۔ یوسفی کا مطلب یہ ہے کہ بچوں نے گھر کی تمام دیواروں کو اپنا سلیٹ بنا کر پراگندی مچا رکھی تھی۔ دوسرا ممکن مفہوم یہ ہے کہ دفتر کی دیواروں کو خود مدیر نے اپنے رف کام کے لیے سلیٹ بنا رکھا تھا۔

آگے کہا کہ کچھ دیر بعد ان ہی میں کا ایک بچہ ایلومینیم کا جگ لے کر آیا اور مشروبِ مشرق یعنی خالص پانی کا دور چلا۔ پانی واقعی نہایت شفاف تھا۔ اتنا شفاف کہ گلاس کا گند اپنی صاف نظر آ رہا تھا۔ اس پیراگراف میں پانی کی تعریف کے پردے میں جس طرح اہل خانہ کی عزت اتاری جا رہی ہے، وہ لائق دید ہے۔ گلاس کو صاف اور گندار کھنے کی ذمہ داری خاتونِ خانہ کی ہوتی تھی اور اب بھی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ گلاس کی جو ملیج کر کے یوسفی نے یہ اشارہ دینے کی کوشش کی ہے کہ گھر کی مالکن بھی صفائی پسند نہ تھیں۔ اب اگر دفتر کی دیواروں کی پراگندگی کے لیے مدیر کو بلا واسطہ ذمہ دار نہ مانا جائے تب بھی یہ مفہوم نکلتا ہے کہ گھر کے سبھی لوگ صفائی بے زار تھے۔ کیوں کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ صاف صفائی کا خیال برابر نہ رکھنے کی وجہ سے گلاس کا پینڈا اپنے اوپر میل کا پینٹ چڑھا لیتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ گھر کے لوگ بالخصوص مدیر محترم کی نظر کبھی اس پینڈے کی گندگی کی طرف نہ ہوگئی۔ گئی ہوگئی اور یقیناً گئی ہوگی مگر یا تو ان کی نظر نے اسے نوٹ نہیں کیا یا جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ دونوں میں سے ہر صورت میں صفائی بے زاری کا الزام ان پر بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس پیراگراف میں یوسفی نے گھر کے تمام افراد کو میل پسند قرار دیا ہے۔

یوسفی کے قلم کی ایک اور نیرنگی ملاحظہ ہو:

”اب تو ان کی تمنا ہے کہ بقیہ عمر عزیز ”بنک اور ڈرافٹ“ پر گوشہ بدنامی میں گزار دیں، لیکن ان کی نیت بڑی نہیں تھی۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے ان کی نیک نیتی کو ابھرنے نہ دیا۔ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت اُداس اور فکر مند پایا۔ بار بار پتلون کی جیب سے پد بیضا نکال کر دیکھ رہے تھے۔ پوچھا، صبحے! کیا بات ہے؟ بولے، کچھ نہیں۔ پروفیسر عبدالقدوس سے قرض لیے تیرہ سال ہونے کو آئے۔ آج یوں ہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے، ورنہ وہ بھی دل میں سوچیں گے کہ شاید میں نادہندہ ہوں۔“

(مزاحیہ: صبحے اینڈ سنز، مشمولہ خاکم بدہن: ۳۱، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی، ۲۰۱۸ء)

صبحے اینڈ سنز کی کتاب دکان نہ چلنی تھی، نہ چلی۔ نتیجہ سامنے تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ کسی کو پیسے واپس نہیں دے پاتے تھے۔ یوسفی کہتے ہیں کہ اب ان کی تمنا یہی بچی ہے کہ زندگی کے باقی دن لوگوں کو ٹرختے ہوئے کٹ جائیں۔ جب لوگوں کو ٹرخانے اور بہلانے کا کام ہو گا تو کبھی کبھی چیک بھی باؤنس ہو گا جس سے بینک کے ریکارڈ میں نام سیاہ ہو گا۔ اس کے لیے یوسفی نے گوشہ تنہائی کی ترکیب کو گوشہ بدنامی سے بدل دیا۔ طنز میں گیرائی پیدا کرتے ہوئے آگے کہتے ہیں کہ لیکن ان کی نیت بڑی نہیں تھی۔ وہ خود بہت اچھے آدمی تھے، ہاں حالات اور زمانے نے ان کی نیک نیتی اور اچھائیوں کے گلابوں کو کھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اور ان کی نیت نیتی کی خوشبو کے چمن میں پھیلنے سے پہلے ہی حسن نیت کے ان کے سارے پھول مرجھا گئے۔ یوسفی اپنے اس دعوے پر یہ دلیل دے رہے ہیں کہ گزشتہ رمضان میں ملاقات ہوئی تو بہت فکر مند تھے۔ خالی ہاتھ کو دیکھ رہے تھے اور تیرہ سال پہلے پروفیسر عبدالقدوس سے لیے گئے اس قرض کا ذکر کر رہے تھے جس کو ابھی تک واپس نہیں کر سکے تھے۔ لیکن اس دلیل کے لیے ان کا بیانیہ بہت معنی خیز ہے۔ قرض لیے تیرہ سال ہو گئے تو یوں ہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اب واپسی کی سبیل کرنی چاہیے۔ مطلب آج تک انھوں نے کبھی سنجیدگی سے اپنے قرضوں کے بارے میں نہیں سوچا کہ کس کا کتنا باقی ہے اور کب نیز کیسے دینا ہے۔ انھیں درجن بھر سال گزارنے کے بعد یہ خیال آرہا ہے کہ پروفیسر عبدالقدوس انھیں اب اتنی مدت بعد قرض ہڑپنے والا سمجھیں گے۔ اس سے پہلے تک نہیں سمجھتے تھے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ قرض کو ذمہ داری اور حقوق العباد ہونے کی وجہ سے لوٹانے کا خیال نہیں ہے، بلکہ محض بدنامی سے بچنے کے لیے واپسی کی تدبیر بنانا چاہ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ کو موسیٰ علیہ السلام کا پد بیضا کہا جو معجزے دکھاتا تھا۔ یعنی ہاتھ کی محنت سے جو کچھ حاصل کرنا تھا، وہ تو انھوں نے نہیں کیا مگر قدرت کے کرشمے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی عمومی ذہنیت پہ بھی طنز ہے۔ مسلمان اپنے حصے کا کام نہ کر کے رب کی مدد، نبیوں کے معجزے اور ولیوں کی کرامتوں کا انتظار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ عام قضیہ ہے کہ مجنوں کی عقل پہ لیلیٰ کے حسن کے علاوہ کسی اور کا جادو نہیں چل سکتا ہے، مگر یوسفی وہ چیز ہیں جن کی قلمی کشش سے مجنوں بھی شہید ہوتے نظر آتے ہیں۔ یوسفی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مشہور ناقد مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

”یوسفی نے اکابر سے بھی غیر شعوری طور پر اثرات قبول کیے ہوں گے لیکن ان کا فن طبع زاد ہے اور کھری انفرادیت اس کو ممتاز رکھتی ہے۔ میں نے ”چراغ تلے“ سے صرف ایک مضمون کا مشتے از خروارے کے طور پر حوالہ دیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ اچھے شعری گلدستوں کی طرح ”چراغ تلے“ اور ”حاکم بدہن“ دونوں اپنی اپنی جگہ سراپا انتخاب ہیں اور ان میں سے چند کو چن کر الگ کرنا مشکل کام ہے۔“

(صاحب طرز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی، از ڈاکٹر مظہر احمد: ۱۶۳-۱۶۴، کتابی دنیا، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء)

مشتاق احمد یوسفی کا فن اس قدر بلند ہے کہ دنیا میں کہیں بھی منعقد ہونے والے بین لسانی ادبی مقابلے میں اردو ادب والے انہیں اپنا نمائندہ بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ یوسفی کی ادبی خصوصیات انہیں ہندی ادب والوں کے لیے بھی پُرکشش شخصیت بنا رہی ہیں۔ مزاحیہ ادب کا ترجمہ سب سے مشکل امر ہے لیکن اس کے باوجود ان کے بعض اقتباسات کا انتخاب ہندی زبان میں شائع ہوا ہے جو ہندی ساہتیہ والوں کو بھی خوب بھارہا ہے۔

☆☆☆